ڈاکٹر نثار ترابی

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کامرس کالج، راولپنڈی

سقوط ڈھاکہ کا سیاسی پس منظر اور غزل میں اس کا تخلیقی وفور

Dr Nisar Turabi

Associate Professor, Department of Urdu, Govt. College of Commerce, Rawalpindi.

Dhaka Fall and Urdu Ghazal

Ghazal is the most popular and rich genre of Urdu literature which manifests various intellectual as well as stylistic trends of our literature. Fall of Dhaka is the worst incident of our near past which has great impacts on our society. Beside other genres of literature, Urdu ghazal also presented a true picture of this disappointment and grief. This article presents an analysis of Urdu ghazal manifesting this situation of our national history.

۱۹۷۰ء کے انتخاب کے بعد ملک جب سیاسی عدم توازن کا شکار ہوا تو اُس نے ملک کو ایک ایسے سیاسی بحران سے دوچار کر دیا کہ آئین سازی کے عمل سے لے کر شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی اختلافات کی خلیج حائل ہونے تک قومی صورتحال اس قدر مخدوش ہوگئی کہ کراچی سے ڈھاکہ تک ہر علاقہ غیر یقینی سیاسی کیفیت کا نقشہ پیش کرنے لگا۔ چٹاگانگ اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں قتل وخوں ریزی کے لرزہ خیز واقعات روز کا معمول بننے لگے۔ مارچ ۱۹۷۱ء کے ابتدائی دنوں میں سیاسی حالات وواقعات میں ظلم و بربریت کی انتہا کر دی گئی۔ ان حالات کی ترجمانی کرتے ہوئے ڈاکٹر صفدر محمود لکھتے ہیں:

> ضلع بوگرہ میں ۱۵۰۰۰ افراد کو گھیرے میں لے کر ہلاک کر دیا گیا، چٹاگانگ کے علاقے میں ۱۰۰۰۰ افراد کو قتل کر دیا گیا، سراج گنج میں ۳۵۰ عورتوں اور بچوں کو ایک ہال نما کمرے میں بند کر کے زندہ جلا دیا گیا۔ ۲۰۰۰ خاندانوں پر مشتمل ایک بستی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔(۱)

مشرقی پاکستان میں ان خوں ریز واقعات کی وجہ سے حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ جن میں امن دوستی کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ بریگیڈیئر صدیق سالک نے اپنی کتاب ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' میں اسی خوں ریز واقعاتی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے اور شیخ مجیب الرحمٰن کی سیاسی حکمتِ عملی کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

> جب عوامی لیگ کے بپھرے ہوئے کارکن علیحدگی کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تیار تھے شیخ مجیب

الرحمٰن نے فوج سے براہ راست ٹکر لینے کے لئے اپنی تیاریاں مکمل کرلیں۔(۲)

گویا امن اور تصفیہ کی کوئی صورت بھی باقی نہ بچی۔ یوں ایک ایسا قومی المیہ رونما ہوا جسے پاکستان کی قومی تاریخ میں ''سقوطِ ڈھاکہ'' کا سانحہ قرار دیا گیا۔ پاکستان کی قومی تاریخ میں یہ افسوسناک واقعہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پیش آیا۔ جسے بلاشبہ پاکستان کی تاریخ میں سیاہ ترین دن کے نام سے یاد کیا جانا چاہیے کہ اس روز وطنِ عزیز کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس کا مشرقی حصہ ہم سے الگ ہوگیا۔ اس طرح سب سے بڑی مسلم ریاست کو تقسیم کے عمل سے دوچار ہونا پڑا۔

پاکستان کی قومی تاریخ میں سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ ایک ایسے المیے کا پیش کار ہے جس نے جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہر پاکستانی کو دُکھ میں مبتلا کر دیا تھا۔ کوئی بھی ارضِ پاک کی اس تقسیم کے حق میں نہیں تھا۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور اس وقت کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر ہر دو کے اختیارات پر قابض جنرل محمد یحییٰ خان کی حکومت کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ سقوطِ ڈھاکہ سے قومی وحدتِ اسلامی کے درودیوار لرز اُٹھے۔ قومی تشخص میں دراڑیں پڑ گئیں اور مغربی پاکستان کے ہر صوبے میں قومی حمّیت وغیرت کا اجتماعی احساس جاگنے کے بجائے علاقائی اور لسانی تعصّبات کے آسیب قدم جمانے لگے۔ علیحدگی پسند عناصر کو اپنی من مانی کرنے کی آزادی مل گئی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوری طرزِ حیات کی جگہ آمرانہ طرزِ زندگی کا چلن عام ہوگیا۔ دوسری طرف مرکزی حکومت کے غیر دانشمندانہ فیصلے نے قومی تاریخ میں ایک ایسے باب کا اضافہ کیا جس کا ورق ورق اُداسی اور پچھتاوے کی ترجمانی کرتا ہے۔ غیر جمہوری عناصر نے قومی وقار کی شناخت گم کر دی۔ یوں جارحیت کے نتیجے میں ملک اپنے ایک لازمی حصے سے محروم ہوگیا۔

غزل کی سطح پر قومی سانحہ کے نقوش مجموعی طور پر اگر کسی مجموعے میں بھرپور اور واضع طور پر اُبھرے ہیں تو وہ مجموعہ ''دیدہء تر'' ہے جو مشرقی پاکستان ہی سے تعلق رکھنے والے ایک اہم غزل گو شاعر اختر لکھنوی کی شعری تصنیف ہے۔ اگرچہ مشرقی پاکستان سے علاقائی تعلق رکھنے والے بعض دوسرے شعراء کے یہاں بھی اس قومی سانحہ کی منظوم شہادت ان کے کلام کا حصہ بنی اور ان میں کچھ شعراء ایسے ہیں جن کی ایک بڑی تعداد اب بھی کراچی میں مقیم ہے وہ شعراء جو بنگلہ دیش سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اُن کے کلام میں اس قومی سانحے کی گونج اگرچہ زیادہ واضح ہے اور اختر لکھنوی کے علاوہ متعدد شعراء کے ہاں غزل کی سطح پر اپنے عصر کا یہ شعری رویہ رجحان میں بدلتا دکھائی دیتا ہے مگر پاکستان کے دوسرے حصوں میں رہنے والے شعراء نے بھی اس سانحے کی شدت کو قومی دردمندی کے احساس کے ساتھ اپنی فکر کا حصہ بنایا اور اُسے غزل کے پیکر میں ڈھالا۔

اسی طرح نظم اور افسانے کی سطح پر بھی اس المیے کا اظہار عصری آشوب کے تناظر میں یکجا ہوا ہے مگر یہاں موضوعاتی تعین کے رو سے ہم صرف اُنہی شعروں کو درج کرنے کے پابند ہیں جو غزل کی ہئیت میں سامنے آئے ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر سے اُبھرنے والے ان غزلیہ نمونوں میں جہاں سیاسی تاریخ کی نشیب وفراز کی داستان پوشیدہ ہے وہاں ان تلخ حقائق کے گہرے ادراک کا شعور بھی اُجاگر ہوتا ہے جن کی موجودگی میں ایک نئے مگر ملال آسا شعری اسلوب اور عصری رویے کو قومی شاعری کا رجحان ساز موضوع بنانے میں مدد دی۔ اختر لکھنوی کے ''دیدہ تر'' کو خصوصی بنیاد بناتے ہوئے ہم اسے زیرِ نظر باب کے آخری حصے میں شامل کریں گے یہاں دیگر ایسے شعراء کے کلام سے شعر درج کیے جاتے ہیں جن میں سقوطِ ڈھاکہ کا درد پنہاں ہے اس ضمن میں پہلے ناصر کاظمی کے ہاں یہ شعری رجحان دیکھتے ہیں:

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے
وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

جنت ماہی گیروں کی
ٹھنڈی رات جزیروں کی
اُس بستی سے آتی ہیں
آوازیں زنجیروں کی

(ناصر کاظمی)

اقبال عظیم (۱۹۱۳ء۔۲۰۰۰ء مضراب، لب کشائی، ماحصل) کے ہاں بنگال میں ہونے والے اس قومی سانحے کی حادثاتی مناظر میں روا رکھے جانے والے مظالم اور تشدد کے پیشِ نظر ذاتی تجربے کی بنا پر جو عکس اُبھرے ہیں اُن کی جھلک یوں ملتی ہے:

ایک ایسا سانحہ پیش آ گیا ہے راہ میں
کارواں تو کارواں خود رہنما خاموش ہے
پا شکستہ ہو کے یوں بیٹھا ہے سارا قافلہ
دم بخود ہیں منزلیں بانگِ درا خاموش ہے

جشنِ شکست ہم نے منایا با اہتمام
غیرت کو دُھوم دھام سے دفنا دیا گیا

''یاد برائے یاد'' اور ''برگ و شبنم'' کے شاعر سید منیر نے اپنے تیسرے شعری مجموعے ''زیرِ شاخِ گُل'' (مطبوعہ ۱۹۹۴ء) کے دیباچے میں سقوطِ ڈھاکہ کی المیاتی قومی فضا پر دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے اور مشرقی بنگال میں اپنے ملازمتی عہد کو حوالہ بناتے ہوئے کہا کہ: ''یہ مجموعہ کسی ادبی خلا کو پُر کرنے کے لئے نہیں لکھا بلکہ اُن حالات و واقعات کا ایک قدرتی شعری عمل ہے اور اُس وقت کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے جس نے اس تاریخی المیے کو جنم دیا''۔(۳)

شبِ فراق سحر تھا ترا خیال وطن
سحر ہوئی تو نہ پایا ترا وصال وطن
مرے فرار میں ہجرت کی کوئی سمت نہیں
کبھی جنوب وطن ہے کبھی شمال وطن

ایسی ویران پُر آسیب گزر گاہ کے بعد
پھر کوئی عزمِ سفر ہو یہ ضروری تو نہیں

سرشار صدیقی (۱۹۲۷ء تا حال، بے نام) کی شعری تصنیف ''خزاں کی آخری شام'' کے صفحہ ۸۵ پر ''چراغاں'' کے نام سے پانچ شعروں پر مشتمل ایک غزل ہے جس کے حاشیے میں ''جنگ ۱۹۷۱ء کے اسیروں کی واپسی'' کی ذیلی سرخی دی گئی ہے:

کئی دلوں کو کئی دل کی حسرتوں کو سلام
جو قافلے میں نہیں اُن کی عظمتوں کو سلام
جو مقتلوں سے کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے
اُنہیں سلام ہو اُن کی شہادتوں کو سلام

اُردو شاعری میں المیہ پاکستان کی دلدوز چیخیں ۱۹۷۱ء کے آغاز ہی سے سُنائی دینے لگیں تھیں۔ جب قتلِ عام کا سلسلہ جاری ہوا تو اُس خونی پس منظر میں سیکڑوں اشعار غزل کے عصری رویوں کا امتیاز بنے۔ نظیر صدیقی لکھتے ہیں: ''دسمبر ۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان کی جنگ فیصلہ کُن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اور حالات پاکستان کے قابو سے باہر ہو چکے تھے..... بالآخر ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہم ہار گئے''۔ (۴)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس قومی سانحہ پر مشرقی پاکستان میں مقیم شعراء کے ساتھ ساتھ مغربی پاکستان میں آباد شعراء نے بھی پوری قوم کے جذبات کی ترجمانی کی اور اس قومی عصری رویے نے سینئر نسل سے تعلق رکھنے والے شعراء ہی کو متاثر نہیں کیا، نئی نسل کے شعراء کو بھی متوجہ کیا ہے۔ یوں متعدد غزل گو شعراء نے اس تاریخی المیے کی یاد میں اپنا تاثر نمایاں کیا:

ہر زیاں نصیبوں کو پھر سے سوچنا ہوگا
کیا لُٹا اندھیروں میں کیا ملا اُجالوں سے
(مقبول نقش)

سورج نے کتنے جسم جلائے ہیں راہ میں
اتنا تو زیرِ سایہ دیوار بولتے
(سیف زلفی)

دن نکلتے ہی وہ خوابوں کے جزیرے کیا ہوئے
صبح کا سورج مری آنکھیں چُرا کر لے گیا
(شہزاد احمد)

عجب تھے شہرِ چراغاں کے دیکھنے والے
دھویں کی سمت نہ دیکھا کہ کس کے گھر کا ہے
(رضی اختر شوق)

اُس وقت بھی خموش رہی چشم پوش رات
جب آخری رفیق بھی دشمن سے مل چکا
(پروین شاکر)

آگ کے سیلاب نے گھیرا ہے سارے شہر کو
ایک رستہ بھی نظر آتا نہیں بچتا ہوا

(جمیل یوسف)

ہمارے قتل کا لینا تھا انتقام جسے
اُس نے خون کی قیمت وصول کرلی ہے

(رئیس امروہوی)

ہوگیا دو نیم بول میری زمیں تیرا بدن
خاک نے رو کر کہا میرا بدن میرا بدن

(افضل منہاس)

چمن میں ہر طرف اپنا لہو دیکھا نہیں جاتا
الٰہی! یہ مآلِ آرزو دیکھا نہیں جاتا

(افسر ماہ پوری)

شفق میں خون ہے دم توڑتے اُجالے کا
میں دن کا قتل سرِ شام دیکھ لیتا ہوں

(غالب عرفان)

بھائی مقابل آکر یوں ڈٹ جائیں گے
کب سوچا تھا بازو بھی کٹ جائیں گے

(خاقان خاور)

ہارنے والوں نے اس رُخ سے بھی سوچا ہوگا
سر کٹانا ہے تو ہتھیار نہ ڈالے جائیں

(جمال احسانی)

کوئی اور تو نہیں ہے پسِ خنجر آزمائی
ہمی قتل ہو رہے ہیں ہمی قتل کر رہے ہیں

(عبیداللہ علیم)

کس طرح ہار گئے رازِ شکست افشا ہو
ہم پہ کیا بیت گئی ہم کو بتایا جائے

(عدیم ہاشمی)

اُس دن ایسی سُرخی تھی اخباروں میں
گونگے ہوگئے شہر کے سارے ہاکر بھی
(جلیل عالی)

بچھڑنے والے ترے دوستوں پہ کیا گزری
یہ کیا ہوا یہ ہمارے گھروں پہ کیا گزری
(زاہدنوید)

یہ کیسا حادثہ گذرا ہے دل پر
پریشانی ہے لیکن غم نہیں ہے
(ذکی آذر)

بہت مشکل ہوئی جاتی تھی اس گھر کی حفاظت
سو ہم نے اس کو آسانی میں آدھا کر دیا ہے
(غضنفر ہاشمی)

لڑے بنا ہم شکست تسلیم کر چکے ہیں
کسے بتائیں کہاں ہیں تیر و کماں ہمارے
(ارشدنعیم)

اب ہم مشرقی پاکستان کے المیاتی پس منظر سے اُبھرنے والے اُس شعری مجموعے (دیدہءتر) کی طرف آتے ہیں جسے سقوطِ ڈھاکہ کے واقعات وسانحات کی موثر عکاسی کرنے والا ایسا غزلیہ مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔اس میں بنگال کے سیاسی آشوب کو باقاعدہ ایک شعری رجحان کا سنگِ میل سمجھا گیا۔''دیدہءتر'' کے شاعر اختر لکھنوی (۱۹۳۴ء۔۱۹۹۵ء) نے آنکھوں دیکھے ان واقعات کی شعری تصویروں کو انفرادی رویے کی اساس پر اجتماعی کرب کا رنگ دے کر آپ بیتی کو جگ بیتی کا ترجمان بنادیا۔فکری اعتبار سے یہ شعری تصویریں سچی دردمندانہ قومی سوچ کے ساتھ ساتھ مسافرت کے اُس دُکھ کو حوالہ بناتی ہیں جو ہجرت کے فطری عمل سے پیدا ہوکر ایک حساس فنکار کی تخلیقی حسّیت میں شامل ہوگئیں اور اسی سبب سے ان میں سچائی اور اثر انگیزی ہے۔''دیدۂ تر'' کی ساری غزلیں سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیاتی موضوع ہی کو مرکز ومحور بناتی ہیں۔ان غزلوں پر بات کرتے ہوئے پروفیسر نظیر صدیقی رقم طراز ہیں:''اختر نے ان غزلوں میں اس المیے کو خونِ جگر سے لکھا ہے جو مشرقی پاکستان میں خونِ بشر سے لکھا گیا تھا۔جو چیز خونِ بشر سے لکھی جاتی ہے وہ تاریخ بنتی ہے اور جو چیز خونِ جگر سے لکھی جاتی ہے وہ ادب اور شاعری کہلاتی ہے''۔(۵)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا واقعہ ہماری قومی تاریخ کے بدترین المیے کی حیثیت رکھتا ہے۔''دیدہءتر'' کے خالق چونکہ ذاتی حیثیت سے اس المناک قومی حادثے کا حصہ رہے ہیں اسی لیے ان کی پیش کردہ غزلیہ کیفیات نے مذکورہ سانحہ کی کوکھ سے پھوٹنے والی ہر لہر کو مجسم کیا۔انسان کے انسان کے ساتھ سلوک کے تجزیاتی مطالعے نے خونی واقعاتی تناظر کو ایک ایک کر کے ہمارے روبرو رکھ دیا ہے۔اختر لکھنوی اپنے تحریر کردہ اظہاریے میں کہتے ہیں کہ:

۱۳/دسمبر ۱۹۷۱ء اور ۴/ مارچ ۱۹۷۴ء کے درمیان ۸۱۴ دنوں میں اس سرزمین پر جہاں زندگی کے بہترین دن گزارے، نفس نفس، قدم قدم ایسے مناظر بھی تھے جن کی دید سے ذہن منجمد اور آنکھیں پتھرا گئیں۔ ۱۹۷۴ء میں جب سکتہ ٹوٹا تو اس شاعری کا ورود ہوا۔ جس سے یہ مجموعہ عبارت ہے۔ اس میں وہی شاعری ہے جو اس المیے سے وجود میں آئی جس نے لاکھوں افراد کا شیرازہ بکھیر دیا، جس سے لاتعداد گھر اُجڑے، مکینوں کے ساتھ مکان جلے، معصوم بچے ماؤں کی گود سے چھین کر نیزوں پر چڑھائے گئے، گلیوں، کوچوں اور بازروں میں قتلِ عام ہوا۔ (۶)

بے بسی میں بے گھری کا ماتم کرنے والے اپنے ہم وطنوں کے احساسات و جذبات کو جس فطری اپنائیت کے ساتھ بیان کیا ہے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے افسر ماہ پوری لکھتے ہیں:

> اختر لکھنوی کا یہ امتیاز قابلِ لحاظ اور قابلِ تحسین ہے کہ انہوں نے اپنی تمام شعری صلاحیتوں اور فنکارانہ قابلیتوں کو اس المیے کی عکاسی و نقاشی پر صرف کر دیا اور جس تسلسل و تنوع کے ساتھ وہ اس المیے کا ماتم کر رہے ہیں وہ اپنی نوعیت کا ایک شعری کارنامہ ہے۔ (۷)

گویا سقوطِ مشرقی پاکستان کے قومی سانحے پر لکھی گئی ان غزلوں میں جس تفصیلات اور جُزئیات سے واقعاتی شہادتوں کے شعری اظہار میں مجسم کیا گیا ہے اُس نے اس شعری تذکرے کو ایک جیتے جاگتے شعری کردار میں ڈھال دیا ہے۔ ایک ایسے کردار میں جس کی زبان سے اس تاریخی المیے کا ورق ورق ماتم کُناں ہے۔ شعری ادب کی تاریخ میں غزل کے وسیلے سے اظہار پانے والے اور خون اور آنسوں سے لکھے گئے اس شعری رجحان کی کچھ جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں:

وہ پرچم وہ سر کے طرّے اور وہ سفینے اپنے تھے
جن کو دیکھ کے شعلے بھی روئے تھے جلتے وقت بہت

کچھ ہاتھوں نے لکھ ہی دیے تاریخ میں اختر
رسوائی کے وہ حرف جو مرقوم نہیں تھے

مجھے خراج دیا قہقہوں کی محفل نے
دو نیم جب مرے ہاتھوں میں مری کمان ہوئی

ایک محرومی کئی نسلوں کی محرومی بنی
ایک منظر کے عقب سے کئی منظر اُبھرے

جو ہوا اُس میں بہت کچھ دخل تھا اپنوں کا بھی
ہم بھی کیا کرتے ہمیں بے دست و پا ہونا ہی تھا

حواشی

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ''پاکستان کیوں ٹوٹا'' صفدر محمود (ڈاکٹر)۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور طبع چہارم، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴۵

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا''، صدیق سالک، مکتبہ سرمد راولپنڈی، بارِنہم ۱۹۹۲ء، ص ۶۶

۳۔ سید منیر ''کچھ اپنی طرف سے''، مشمولہ ''زیرِ شاخِ گُل''، اساطیر، لاہور، ۱۹۹۴ء

۴۔ نظیر صدیقی، پروفیسر، ''پاکستانی غزل ۷۰ اور ۸۰ کے درمیان''، مشمولہ ''جدید اُردو غزل-ایک مطالعہ''، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۱۹۶

۵۔ نظیر صدیقی، پروفیسر، ''اختر لکھنوی کی غزلیں''، مشمولہ ''دیدہ ءتر''، بزمِ اربابِ سخن، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱، ۱۲

۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''دیدہ ءتر''، اختر لکھنوی، ایضاً، ص ۳۲

۷۔ افسر ماہ پوری، ''دیدہ شُنیدہ''، مشمولہ ''دیدہ ءتر''، ص ۳۲